OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

فنون لطیفہ اور فکرِ اقبال: ایک مطالعہ

A Study of Allama Iqbal's Perspective on Arts

Talib Hussain Hashmi
Doctoral Candidate, Department of Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad
Dr. Syed Shiraz Ali Zaidi
In charge, Department of Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad

Abstract

Allama Iqbal is a poet of life, creation, evolution, passion and love. Life is a creative process for them. According to Iqbal, the value of this art is that it is life-giving and an interpreter of life. However, according to them, skill and art should be such that it is possible to achieve the highest values of life, to lead the society from low to high. According to Iqbal, art is that which gives life and is the interpreter of life, which moves the dead and depressed emotions, which teaches to live and die for a higher purpose. The true art is the one who makes his art a means of curing national diseases, the purpose of art is to enhance the beauty of life and to lead the society from low to high, to familiarize with the pleasure of revolution and to usher in a new era, a new era. In the search for revolution, one has to keep a hot head. Iqbal Jalali attaches great importance to trend. It is an expression of glory and self-power, creative values, creative meanings and the existence of the universe depends on it.

Key Words: Art, Creation, Evolution, Passion and Love

CC BY

تمہید

علامہ اقبالؒ زندگی، تخلیق، ارتقاء، جوش و عشق کے شاعر ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک ایک تخلیقی عمل ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک اس فن کی بہر قدر ہے جو حیات بخش اور زندگی کا ترجمان ہے۔ چناں چہ ان کے مطابق ہنر و فن ایسا ہونا چاہیے جس سے زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حصول ممکن ہو، معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف گامزن کرے۔ اس اہم پہلو کو اقبالؒ نے بڑی خوبصورتی سے "ضربِ کلیم" میں کچھ یوں بیان کیا ہے:۔

اے اہل نظر ذوقِ نظر خُوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا[1]

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی فرماتے ہیں:۔

"اقبالؒ کے نزدیک فن وہی ہے جو زندگی بخش ہو اور زندگی کا ترجمان ہو، جو مردہ و افسردہ جذبات کو حرکت میں لائے، جو بلند نصب العین کے لیے جینا مرنا سکھائے۔ حقیقی فن کار وہ ہے جو اپنے فن کو قومی امراض کے دفعیہ کا ذریعہ بنائے، فن کا مقصد زندگی کے حسن کو نکھارنا اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانا، انقلاب کی لذت سے آشنا کرنا اور ہر آن ایک نئے دور، ایک نئے انقلاب کی جستجو میں سرگرم عمل رکھنا ہے"۔[2]

"اقبال جلالی رجحان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ جلال و قوت خودی کا اظہار ہے، خلاق اقدار ہے، خلاق معانی ہے اور کائنات کا وجود اسی پر منحصر ہے"۔[3]

علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاعری، موسیقی، مصوری کا مقصد انسانیت کو بلند کرنا ہے تو قابل تحسین ہے، اس کے برعکس اگر یہ انسانیت کی ترقی میں حائل ہے تو ایسے فن سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:"اقبالؒ کے تصور فن میں بلند مقاصد کا حصول اس فن سے ہوتا ہے جس کی پرورش خون جگر سے ہو۔[4]

رنگ ہو خشت و سنگ، چنگ ہو یا حروف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود[5]

بندگی نامہ کا تعارف

"بندگی نامہ" اقبال کی مختصر ترین فارسی مثنوی ہے، جو صرف ۱۶۸ / اشعار پر مشتمل ہے لیکن اپنی بلاغت اور فنی خُوبیوں کے اعتبار سے اِقبال کے کسی بھی دُوسرے شہ پارے سے کم نہیں۔ اختصار کے باعث اُسے ہم اُن کی ایک کوچک مثنوی ضرور کہہ سکتے ہیں لیکن اسے بھی اقبال کی شاعری میں وہی مقام حاصل ہے جو اُن کی کسی بھی دوسری اہم نظم کو حاصل ہو سکتا ہے۔ "بندگی نامہ" بھی اقبال کی تمام بڑی اور اہم مثنویوں کی مثنوی معنوی کی بحر میں ہے۔ شاید اس موضوع پر یعنی محکومی اور بندگی کے موضوع پر۔۔۔ دُنیا میں اور کوئی نظم یا مثنوی نہیں لکھی گئی۔ اس لیے اس مثنوی کو بھی اقبال کا ایک منفرد فنی کارنامہ قرار دینا مبالغہ نہ ہو گا۔ یہ مثنوی چار بڑے عنوانات (ابواب) پر مشتمل ہے،۔۔۔۔۔۔یعنی

(۱)۔ بندگی نامہ (تمہید) (۲)۔ در بیانِ فنونِ لطیفہ غلامان

(۳)۔مذہبِ غلامان (۴)۔در فنِ تعمیرِ مردانِ آزاد[6]

عتیق انور راجا "روزنامہ ایکسپریس" کالم میں رقم طراز ہیں:۔

"عام طور پر فنون لطیفہ کی چار اقسام بیان کی جاتی ہیں۔ اول، زبان و ادب یعنی شاعری ناول، افسانہ، کالم وغیرہ دوسری قسم میں تھیٹر، رقص، موسیقی، ڈرامہ، فلم وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ تیسری قسم میں سنگ تراشی، مجسمہ سازی وغیرہ شامل ہیں۔ اور چوتھی قسم میں آرائشی فنون جیسے ٹیکسٹائل، دستکاری کے نمونے، عمارتی فنون، خطاطی، مصوری وغیرہ کا نام آتا ہے"۔[7]

جس دور میں "بندگی نامہ" شائع ہوئی، یہ وہ دور تھا جب برصغیر برطانیہ کا محکوم تھا اور بقول شاعر زندگی ایک جُوئے کم آب کی مانند گھٹ کے رہ گئی تھی۔ علامہ اقبال کو آزادی کی حسرت تھی جس میں زندگی ایک بحر بیکراں بن کر وُسعت پذیر ہوتی ہے۔ ان کی پوری شاعری میں آزادی کی بے تاب تمنا کا اظہار ہوتا ہے اور ملوکیت اور فرنگ کی ذہنی اور سیاسی حاکمیت کے خلاف نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ "بندگی نامہ" میں غلام اقوام کی موسیقی پر موت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اس میں نہ سوز کی دولت ہے اور نہ اُمید کی جھلک، نہ ذوق فردا ہے اور نہ لذت امروز، ہاں بیزاری کا پیغام ضرور ملتا ہے، اور ایک مریضانہ غم کا شدید احساس اس پر یقیناً طاری ہے۔

بندگی نامہ (تمہید)

علامہ اقبال نے پہلے ایک تمہید لکھی ہے اس کے بعد انہوں نے غلام قوموں کے فنونِ لطیفہ (موسیقی اور مصوری پر) تبصرہ کیا ہے بعد ازاں اِن کے مذہب کی تصویر کھینچی ہے۔ آخر میں آزاد قوموں کے فنِ تعمیر کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ علامہ اقبال نے اس پوری مثنوی "بندگی نامہ" میں مختلف عنوانات کے تحت غلامی کی مذمت کی ہے۔ ابتدا میں چاند اور سورج کی گفت گو ہے۔ زمین کا قریب ترین ہمسایہ سُورج ہے جو غلامی کی برائیاں بیان کرتا نظر آتا ہے:

گُفت بایزداں مہِ گیتی فروز

تابِ من شب را کند مانند روز[8]

علامہ اقبال کی اس مثنوی کا آغاز ایک ڈرامائی انداز سے ہوتا ہے۔ "مہ گیتی فروز" نے ایک بار اللہ عزوجل سے کہا کہ مُجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب روز و شب کی گردش نہیں تھی اور مَیں وقت کے ضمیر میں سویا ہوا تھا۔ نہ میرے نور سے دشت و در آئینہ پوش تھے، اور نہ میرے حسن کشش سے دریا میں موجوں کا خروش تھا، افسوس وجود کی اس نیرنگی اور افسوں طرازی پر، افسوس اس چمک دمک اور ذوقِ نمود پر، مَیں نے سُورج سے چمکنا سیکھ لیا اور ایک مُردہ خاک دان کو بھی چمکا دیا، وہ خاکدان جو منور تو ہے لیکن بافراغ نہیں۔ اس کے چہرے پر غلامی کے داغ ہیں۔ اس کا آدم یزداں کُش اور آدم پرست ہے۔ اے خدا! جب سے تُو نے مجھے اس عالم آب و گِل میں پیدا کیا ہے، مَیں اِس کرۂ ارضی کے طواف سے خجل ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ دُنیا نورِ جاں سے واقف ہی نہیں بلکہ یہ دُنیا مہر و ماہ کی جلوہ سامانیوں کی مُستحق ہی نہیں۔

در فضائے نیلگوں اُورا بہل

رشتۂ مانوریان از وَی گسل[9]

"اس آدم کو فضائے نیلگوں میں گم کر دے اور ہم در خشندہ سیاروں کا رشتہ اس سے منقطع کر دے۔ مختصر یہ کہ یا مجھے اس سیارے کی خدمت سے موقوف فرما، یا پھر اس کی خاک سے کوئی نیا آدم پیدا کر۔"[10]

علامہ اقبال غلامی کے نقصانات بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ غلام شخص کا بدن بے رُوح ہوتا ہے اور اس سے انسان کی حیاتِ اجتماعی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ اپنی ایکائی چھوڑ کر ایسے افراد میں منقسم ہو جاتی ہے۔ جو غلامی کے درد ولالچ کے عالم میں ایک دُوسرے کا گلا گھونٹنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔

از غلامی بزم ملت فرد فرد

ایں و آں با ایں و آں اندر نبرد[11]

غلامی کی وجہ سے خوف، بزدلی اور پست ہمتی کو فروغ ہوتا ہے۔ ذوقِ سلیم پر کاری ضرب لگتی ہے، انسان غلط اقدار کو پوجنے لگتا ہے اور وہ زندگی کی آبرو کھو بیٹھتا ہے اور جانوروں سے بھی پست ہو جاتا ہے۔ غلام افراد کی موسیقی رونے، دھونے ماتم کرنے اور حالات سے نباہ رکھنے کے درس پر مشتمل ہے:

من نمی گویم کہ آہنگش خطاست

بیوہ زن را این چنیں شیوں رواست[12]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

"اقبال فنونِ لطیفہ کو محض دل بہلانے کا مشغلہ نہیں، بلکہ زندگی کی تعمیر، تطہیر اور تزئین کا نہایت ہی موثر اور معتبر وسیلہ سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں شاعری، انسان کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں، بلکہ ایک ایسا آلہ ہے جو کارزارِ حیات میں علم و حکمت سے زیادہ کارگر ہے"۔[13]

دربیانِ فنون لطیفہ غلاماں

علامہ اقبال ایسے فنون لطیفہ کے قائل تھے جو حیات بخش ہو۔ جس سے خُودی مستحکم ہو جس سے حرکت و عمل کو تحریک ملے جس سے انسان کو ذہنی اور رُوحانی طور پر اخلاقی توانائی حاصل ہو۔ علامہ اقبال ایسے فنون لطیفہ جن سے انسان کاہل، سست ہو جائے، بے عملی ہو جائے، تحریک نہ پیدا رہے یا جو بالکل بلا مقصد ہوں جن سے کوئی اخلاقی سبق نہ ملے ایسے فنون لطیفہ کو علامہ اقبال پسند نہیں فرماتے تھے۔ جو خُودی کو مستحکم کرے وہ حیات بخش ہے اور جو خُودی کو کمزور کرے وہ حیات کش ہے۔ علامہ اقبال نے غلاموں کے فنون لطیفہ کا بڑا روح کش اور اذیت ناک نقشہ بڑے دردمندانہ انداز میں کھینچا ہے اور کہتے ہیں۔

"غلامی سے انسان کے تمام قوائے عمل مجروح ہو جاتے ہیں۔ فطرت کے عمل اور اس کی نمود میں تسخیر و تصرف کی جو بہت سی صلاحیتیں انسان کو حاصل ہیں ان میں سے ایک فنون لطیفہ ہے جو ان کے تخلیقی عمل کو واضح کرتی ہے کیوں کہ اقبال کے نزدیک فنون لطیفہ زندگی کی نقل نہیں۔ وہ ارسطو کے بنیادی نظریے کو بہت جامد تصور کرتے ہیں۔ بلکہ تخلیق وارتقا میں زندگی کی اعانت کرتے ہیں"۔[14]

ضرب کلیم میں علامہ فرماتے ہیں:۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصود ہنر، سوزِ حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا[15]

موسیقی

غلامی سے فنون لطیفہ کی صلاحیت تخلیق و تصرف کو بڑا سخت نقصان پہنچتا ہے۔ غلامی میں زندگی کی طرح آرٹ بھی گھٹ کر رہ جاتا ہے اور جو آرٹ غلامی کی پیداوار ہے اس میں موت کا سا سکوت چھا جاتا ہے، اور وہ موسیقی جو غلامی میں لکھی گئی ہو، زندگی کے جہنم کی آگ سے خالی ہوتی ہے وہ ایک سیلاب ہے جو حیات کی دیوار کو ڈھادے اور اسی موسیقی جو دل کے تاروں کو نہ چھیڑے موت کا نغمہ ہے۔

> ''شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اقبال ایک عظیم شاعر تھے، وہ سر، سنگیت اور لے کا ایک عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ وہ اکثر اپنا کلام ترنم اور سر کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ اقبال کا انداز جمال و جلال کا حسین امتزاج تھا۔ اکثر اوقات آپ کی نظمیں سن کر لوگ رونے لگتے۔ اقبال کی موسیقی سے وابستگی کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ''گانا سننے کا شوق تو والد کو بھی تھا۔ جوانی میں ستار بجاتے تھے۔ جب کبھی فقیر جمال دین انھیں طائوس بجا کر سناتے تو مجھے بھی ساتھ بٹھالیا کرتے''۔[16]

مثلاً ایک جگہ علامہ فرماتے ہیں:

نوا کو کرتا ہے موج نفس سے زہر آلود
وہ نَے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں[17]

جب کہ موسیقی کے مطلق اپنی مثنوی ''بندگی نامہ'' میں اظہار خیال کرتے ہیں:

مرگ ہا اندر فنون بندگی
من چہ گویم از فسون بندگی
تشنہ کامی؟ ایں حرم بے زمزم است
در، وزیرش ہلاک آدم است[18]

یہ غلامی کی موسیقی انسان کو ناتواں بناتی ہے۔ اسے دنیا سے بیزار کر دیتی ہے علامہ نے غم کی دو قسمیں قرار دی ہیں ایک تو وہ غم جو انسان کو کھا جاتا ہے اور دوسرا غم جو ہر غم کو کھا جائے:۔

یک غم است آں غم کہ آدم راخورد
آں غم دیگر کہ ہر غم راخورد[19]

علامہ اقبال کو اس بات کی ہمیشہ تشنگی رہی کہ مسلمان قوم بذات خود موسیقی میں اپنا مقام نہیں بنا سکی بلکہ جس علاقہ میں گئے وہاں کی موسیقی میں اپنے رنگ کو رنگ لیا۔

"مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیا نے ان قوموں کی بھی طبعی نسانیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں، ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے اور "حال انہیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اس وجہ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا مقامی فن موسیقی رائج ہے۔ مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی"۔[20]

بندگی چوں کہ راز حیات سے نا آشنا ہے، اس لیے اس کی موسیقی اور اس کا نغمہ اس دوسرے سے غم خالی ہے۔ علامہ کے نزدیکی موسیقی وہی فائدہ مند ہے جو جنون پرور ہو۔ مثلاً ان کے خیالات ضرب کلیم میں کچھ یوں ہیں:۔

فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرار فن
شعر گویا روحِ موسیقی ہے، رقص اس کا بدن[21]

جب کہ مثنوی "بندگی نامہ" میں کہتے ہیں کہ موسیقی ایک مقام ہے وہ جہاں بلالفظ محض آغاز سے معنی پیدا ہوں:

می شناسی؟ در سرودِ آں مقام
کاندروبی حرف می روید کلام[22]

علامہ اقبال مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

"لاہور میں گرمی کا زور ہے اور اس پر گوہر جان کا نغمہ جگر سوز، فضائے لاہور کی حدت پر مستزاد ہے"۔[23]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نالہ و سرود[24]

المختصر غلام چوں کہ زندگی کی حقیقت سے بیگانہ ہوتا ہے اس لیے غلامی کی زندگی کو قبول کر لیتا ہے اور علامہ کے نزدیک ایسی زندگی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ زندگی عشق حقیقی کا دوسرا رخ ہے تو وہ کبھی بھی ایسی لعنت کو قبول نہیں کرے گا۔

مصوری

غلاموں کا فن مصوری بھی ان کے فن موسیقی کی طرح ذہنی پستی کا آئینہ دار ہوتا ہے نہ اس میں تخلیقی قوت پائی جاتی ہے اور تقلیدی کیفیت نظر آتی ہے۔ یعنی اس میں کسی قسم کی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔ علامہ کو ہندستان کے تمام مکاتیب کی مصوری سے شکایت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ نے اپنی غلام قوم کے فنکاروں کو فن کا ایک صحت مند و توانا اور جاندار تصور پیش کرتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک آرٹ (مصوری) قوم کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ہماری مصوری کو دیکھے تو اس کو ملت کا زاویہ نگاہ، اس کی تمنائیں اور آرزوئیں کہیں نظر نہیں آتیں۔

> ''اقبال مصور نہ تھے مگر مصوری سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ حتٰی کہ اپنے صاحب زادے جاوید اقبال کے ذوق مصوری کو بڑھانے کے لیے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے آرٹ کی کتابیں منگوا کر دیں''۔[25]

> ''مسلمانوں کے فن مصوری کے بارے میں بھی اقبال مطمئن نہ تھے۔ انھیں اس بات کا ملال تھا کہ ہمارے مصور محض نقالی کر رہے، تصاویر میں خودی کا فقدان ہے، حسن تخیل دور دور تک نظر نہیں آتا اور اس کی بڑی وجہ غلامی کو قرار دیا کیوں کہ عہد غلامی میں فنکاروں کی تخلیقانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے نہیں آ سکتیں۔ ایک موقع پر اقبال نے کہا تھا کہ آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموئی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے اور اسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے ا،س وقت تک آرٹ زندہ اور جاندار بنتا ہے بلکہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پزیری کے ذریعے ظاہری ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم زوال پر آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیزوں سے، مغز سے معنی سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ چھلکے سے، شکل سے دلبستگی بڑھ جاتی ہے۔ یہی آرٹ کی زوال پزیری ہے''۔[26]

مغرب میں نشاۃ ثانیہ سے قبل کلاسیکی آرٹ موجود تھا جس میں عیسوی تصورات کی آمیزش ہو گئی تھی۔ نشاۃ ثانیہ میں جب حیات فرنگ نے ایک نئی کروٹ لی تو ایک نیا آرٹ پیدا ہو گیا۔ مائیکل انجیلو اور ریمبرانٹ وغیرہ اس نئی زندگی کا اظہار رنگ و سنگ میں کرتے ہیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن میں مصوری کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ عصر حاضر میں جب یہاں مصوری کی طرف توجہ ہوئی زیادہ تر اس میں فرنگ کے مختلف اسکولوں کی کورانہ تقلید تھی کچھ ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے راجپوت اسکولوں کی پیروی کی، کچھ قدیم مغل روایات کے مقلد ہو گئے ان تصویروں میں بھی اپنے وطن اور اپنی قوم کے جذبات کہیں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اقبال نے ایسے شعرا کی مذمت کی ہے جو قوم میں جذبے کی بجائے نیند پیدا کرتا ہے، دیباچۂ مرقعِ چغتائی میں لکھتے ہیں:

"کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک، اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دل لبھا سکے، قوم کیلئے نسبت اٹیلا یا چنگیز خان کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ہو سکتی ہے۔"[27]

یہی وجہ ہے کہ علامہ نے "بند گی نامہ" میں موجودہ ہندوستانی مصوری کے پیش پا افتادہ موضوعات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بعض موضوعات چغتائی کی تصویروں کے بھی ہیں۔ اس مصوری میں نہ ابراہیمی ہے نہ آذری، نہ ایمان ہے نہ کفر، نہ جنت کا گداز ہے۔ جہنم کی تپش، اس کے موضوعات کی فہرست چند انگلیوں پر گن لیجیے۔ علامہ اقبال اپنی غلام قوم کے فنکاروں کو فن کا ایک صحت مند توانا اور جاندار تصور پیش کرتا ہے۔ غلام قوم کی مصوری کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں۔ تصویریں بنانے لگا تو ایسی کہ کوئی راہب ہوس کے دام میں اسیر ہے۔ کوئی حسینہ قفس میں اسیر پرندے کے پاس کھڑی ہے۔ کوئی بادشاہ کسی خرقہ پوش فقیر سے مل رہا ہے۔ کوئی پہاڑی مزدور لکڑیوں کا گھٹا اٹھائے ہوئے ہے۔ کوئی نازنین مندر کی طرف محو خرام ہے۔ کوئی جوگی ویرانے میں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ کوئی بوڑھا بڑھاپے کے صدمے سے چور ہے اور اس کے ہاتھ میں بجھا ہوا چراغ ہے۔ کوئی مُطرِب ہے کسی اجنبی نغمے سے مست ہے۔

راہبے در حلقہ دامِ ہوس
دلبرے باطائرے اندر قفس
نوجوانے از نگاہے خوردہ تیر
کودکے بر گردنِ بابائے پیر[28]

جدید ہندوستان کی مصوری پر اقبال کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا جس کا ذکر وہ ایک جگہ یوں کرتے ہیں:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار![29]

اس آخری شعر کا مطلب یہ نہیں کہ عورت جدید شاعروں یا مصوروں کا خاص موضوع ہے بلکہ یہ ہے کہ عورت ان کے ذہن پر اس قدر چھا گئی ہے، وہ ان کے اور زندگی کے درمیان ایک حجاب بن گئی ہے اور مصور یا شاعر اپنی تمام جنسی تمنائیں جو زندگی میں ناکام رہتی ہیں اپنے فن میں پوری کر لیتے ہیں۔ ایسی مصوری اور ایسا آرٹ آزادی ہی کے عالم میں وجود آسکتا ہے کیوں کہ غلامی میں محض جسم باقی رہ جاتا ہے جان سلب ہو جاتی ہے اور دل سے ذوق ایجاد چلا جاتا ہے:

ذوقِ ایجاد و نمود از دل رود
آدمی از خویشتن غافل رود[30]

علامہ اقبال اکثر کہا کرتے تھے کہ شاعری کو سمجھنے کے لیے مصوری سے مدد لی جاسکتی ہے۔ مصور مشرق عبدالرحمان چغتائی علامہ اقبال کے الفاظ لکھتے ہیں۔

"عبدالرحمٰن میری خواہش ہے میری کتاب "جاوید نامہ" مصور شائع ہو اور اسے مغرب میں پھیلا دیا جائے۔۔۔ اوپر فارسی اور نیچے انگریزی اور سامنے تمھاری تصویر۔ دیکھنا اس کے کس قدر خوش گوار نتائج بر آمد ہوں گے"۔[31]

حقیقیت یہ ہے کہ جب تک قوم کو اپنی خُودی کا احساس نہ ہو تب تک مصوری زندگی کی ترجمان نہیں بن سکتی۔

مذہب غلاماں

آرٹ انسان کے عشق یا یقین کی ایک تخلیقی نمود ہے جو آزادی ہی کے عالم میں صحیح طور پر ظاہر ہو سکتی ہے۔ غلامی اگر آرٹ کے موت ہے تو مذہب کے اس بھی زیادہ مہلک ہے کیوں کہ غلامی عشق اور مذہب میں فرق ڈالتی ہے۔

در غلامی عشق و مذہب را فراق
انگبین زندگانی بد مذاق
در غلامی عشق جز گفتار نیست
کار ما گفتار ما یار نیست
کاروان شوق بے ذوق رحیل
بے یقین و بے سبیل و بے دلیل[32]

علامہ اقبال غلاموں کی زندگیوں کے بارے میں بڑی وضاحت سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں غلام ہمیشہ مذہب کو بیچتا ہے اور اس کو خرید و فروخت کی سمجھتا ہے۔ چناں چہ علامہ اقبال نے بارہا کہا کہ "خودی" اور "انا الحق" اگر آزادی سے وابستہ ہوں تو یہ روحانی ارتقا کے مدارج ہیں لیکن اگر یہ غلامی کے پروردہ اور زندگی سے گریز ہوں تو موت ہی موت ہے۔

خود گیری و خود داری و گلبانگ 'انا الحق'
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا 'ہمہ اوست'
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات![33]

جب کہ علامہ اقبال نے بندگی نامہ میں غلاموں کے مذہب کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان نظر میں جب تک وہ دین و دانش سے دستبردار نہ ہو جائے مردہ ہیں اور فرمانروا کی مکمل اطاعت گذاری ہی میں زندگی ہے کیونکہ غلاموں کا خدا ہی ہے جو روٹی دیتا ہے ان کے (علامہ) یہ اشعار فرمانرواؤں کے آداب خدائی اور غلامی کی راہ رسم بندگی پر بھرپور کاری ضرب ہے:

گرچہ بر لب ہائے او نام خدا است
قبلہ او طاقت فرمانرواست[34]

علامہ اقبال کے نزدیک فرمانروا کی طاقت دروغ ہے یعنی باطل ہے مگر طاقت کی بدولت اس دروغ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ لہذا اگر توہمت سے کام لے کر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سربکف ہو جائے تو یہ باطل مٹ جائے گا۔ غلام بظاہر زندہ نظر آتا ہے لیکن چوں کہ غلام اللہ سے دور ہوتا ہے اس لیے حقیقت کے اعتبار سے مردہ ہوتا ہے ان کے نزدیک روح انسانی، اگر حق تعالی سے وابستہ ہو تو زندہ ہے۔

روح با حق زندہ و پاینده ایست
ورنہ ایں را مردہ آں را زندہ ایست[35]

غلاموں کی روح مردہ ہو جاتی ہے نیز جی حضوری میں ان کے اندر "دیدار ذوق" پیدا نہیں ہو سکتا۔

از غلامی ذوق دیدار مجوے

از غلامے جانِ بیدارے مجوے[36]

غلامی میں انسان کا جسم غلام نہیں ہوتا بلکہ اس کی روح زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے اس لیے غلاموں کی زندگی مشکل کا مصداق بن جاتی ہے۔

در فنِ تعمیر مردانِ آزاد

فن تعمیر سے مسلمانوں کو ایک تعلق خاص رہا ہے اور اس فن اور اس فن میں مسلمانوں نے جو نام پیدا کیا ہے۔ اسے تاریخ عالم بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ فن تعمیر اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک قوم کی تاریخ اور اس کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ اس کے جلال و جمال شان و شوکت اور فن کی کمالات کا عکس جمیل جھلکتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کی تعمیر کی ہوئی غیر فانی عمارات پر توجہ دی ہے۔ جن میں مسجدِ قرطبہ اس اعتبار سے زیادہ اہم ہے اس سے اقبال کے نظریہ فن کی بڑی حد تک وضاحت ہوتی ہے۔ اس نظم میں اشیائے کائنات کے نقوش وقت کے ساتھ دھندلا جائے اور بالآخر مٹ جانے کا شدید شدید احساس موجود ہے:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر

کار جہاں بے ثبات! کار جہاں بے ثبات

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا

نقشِ کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا[37]

مثنوی "بندگی نامہ" میں بھی آزاد آرٹ کی مثال بڑی خوب صورتی سے دی ہے جس میں اقبال نے دہلی کے قدیم سلطانوں "قطب الدین ایبک" اور "شیر شاہ سوری" کے فن تعمیر کے متعلق بتایا ہے کہ اگر تجھے فرصت ہو تو ایک نظر اپنے اسلاف کی صفت کو بھی دیکھ لے ان کے فن تعمیر میں قدر آفریں خودی کی نمود ہے اُنہوں نے مسجد قرطبہ کے بنانے والوں کی طرح زمانِ مسلسل اور اس کے مرور کو دورانِ خالص کے آنِ واحد میں حل کر دیا ہے ان تعمیر سے ان کے اپنے ضمیر اور ان کی ہمت کا سراغ ملتا ہے۔

یک زماں بار فتنگاں صحبت گزیں

صنعتِ آزاد مرداں ہم بہ بیں

خیز و کار ایبک۔ سوری نگر

وانما چشمے اگر داری جگر

خویش راز خود بروں آوردہ اند

ایں چنیں خود را تماشا گر دہ اند[38]

علامہ کے نزدیک آزاد فن تعمیر کی دو خصوصیتیں ہیں ایک ہمت مردانہ اور دوسرے طبع بلند ان کے فن کا استحکام بھی مسجد قرطبہ کی طرح یقین یا "عشق" یا "وجدان" یا "دانشِ برہانی" پر ہے۔ یہ آرٹ یعنی ایبک اور سوری کا آرٹ دلبری یا قاہری ہے۔ اس

میں شوکت و جبروت کی جھلک نمایاں ہے کیوں کہ یہ تاریخی آثاران مسلمانوں کے ہیں جو آزاد تھے اور اپنی روزی اپنی قوتِ بازو سے حاصل کرتے تھے۔ میں چوں کہ غلام ہوں اس لیے میں تجھے ان مسلمانوں کے حالات سے مطلع نہیں کر سکتا، غلام کیا جانے کہ آزاد تو میں کیسی ہوتی ہیں؟ کیوں کہ غلام لوگ ان حالات و کیفیات سے آگاہ نہیں ہوتے اور نہ ہی اندازہ لگا سکتے ہیں جو آزاد لوگوں کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام[39]

اس لیے وہ ''بندگی نامہ'' میں اپنی کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

محکمی ہا از یقین محکم است
وائے من شاخ یقینم بے نم است
در من آں نیروے الا اللہ نیست
سجدہ ام شایان ایں درگاہ نیست[40]

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں بڑے بڑے عظیم الشان معجزہائے ھنر صفحہ ہستی سے ناپید ہو گئے۔ کہیں کھنڈر باقی ہیں اور کہیں نشان بھی نہیں ملتا۔ ''بندگی نامہ'' میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے ہزارہا تعمیر کے اعلیٰ نمونے پیدا کیے۔ اب ان میں خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں لیکن سارا جہان ''تاج محل'' کو دیکھنے آتا ہے اور اسے معجزۂ فن سمجھتا ہے کیوں کہ ''تاج محل'' کا فن تعمیر دلبری و بے قاہری کا نمونہ ہے:

مرمرش زآب رواں گردندہ تر
یک دم آنجا از ابد پائندہ[41]

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں آرٹ کا محرک مردانہ عشق ہے جس سے سنگ وحشت کے نئے اگل رہے ہیں یہ عشق حُسن کا پردہ بھی ہے پردہ دار بھی۔

عشق مرداں پاک ورنگیں چوں بہشت
می کشاید نہ ہا از سنگ و خِشت[42]

بہر حال اقبال نے آرٹ کے اس تصور میں عوام الناس کی معاشی غلامی کے پرتو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کا سراغ ایبکؔ و سوریؔ کی دلبری با قاہری اور تاج محل کی دلبری بے قاہری دونوں میں ملتا ہے اور زیادہ تر عشق کے جذبے کو سراہا۔ اقبال کو یہ خصوصیت پسند تھی اور اسی وجہ سے مسجد قُوت الاسلام نے انہیں اتنا مسحور کیا۔ پروفیسر حمید خان صاحب نے اقبال سے اپنی ایک ملاقات کا بڑا دل چسپ حال لکھا ہے۔ اقبال کی زبانی و تاج محل کے متعلق اقبال کا قول اور مکالمہ انہوں نے یوں نقل کیا ہے۔

''مسجد قوت الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی، بعض کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کا ضعف آگیا ہے اور در اصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لیے توازن قائم کرتا ہے''۔[43]

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ اشیائے کائنات زمانے کی دستبرد سے فنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ نقوش انمٹ ہوتے ہیں جن کی تخلیق و تعمیر کی مرد خدا نے کی ہو۔ کیوں کہ مرد خدا کے فکر و عمل میں اس عشق کی جلوہ گری موجود ہوتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔ عشق کی بدولت انسان اپنے اندر قاہری و دلبری کی خصوصیات پیدا کر سکتا ہے جو علامہ کے ہاں یوں ہے۔

ولبری بے قاہری جادو گری است
دلبری با قاہری پیغمبری است[44]

غرض اقبال کا نظریہ فن بھی ان کے فلسفہ خودی و عشق کا اہم حصہ ہے وہ فن کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے قوم کے تعمیر پہلو کا عکاس ہونا چاہیے۔ ایسا فن جو اسلامی عقائد و نظریات کے مطابق ذہن انسانی میں روشنی اور قلب میں گرمی پیدا نہ کر سکے فن کہلانے کا مستحق نہیں اور عشق کے جذبے کے بغیر زندگی کمال سے نا آشنا رہتی ہے۔ جذبہ انسان کو معراج حیات عطا کرتا ہے، اسے مستحکم بنانا اور موجودات کی تسخیر پر آمادہ کرتا ہے۔ یہی نور حیات اور نارِ حیات ہے۔ زندگی کا سوز و ساز اسی سے مکمل ہوتا ہے اور رزم گاہِ حیات میں اس کے وسیلے سے کشور کار ممکن ہے یعنی:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق
رزم گاہِ حیات میں بدر و حنین بھی ہے عشق[45]

الغرض اقبال فنون لطیفہ کو انسانی سماج میں ایک اہم فیکٹر گردانتے ہیں۔ ان کے خیال میں صحت مندانہ بنیادوں پر تخلیق کئے فنون جو حیات آور عناصر کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہوں کسی قوم کی ترقی کے لیے بڑے
کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ بلکہ قوموں کی زندگی کا دارومدار ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کے فنون کی کیفیت کیا ہے؟ کیا ان کے تخلیق کردہ فن پارے زندگی کے ساتھ آنکھیں چار کر سکتے ہیں یا اس سے آنکھیں چرانے کی کوشش میں لگے ہیں؟
یہی وجہ ہے کہ جب کوئی غیر حیات آور نظریہ فن کا خوبصورت لبادہ اوڑھ کر آتا ہے تو اس سے اکثر ترقی یافتہ معاشرے بھی تنزل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور تنزل کے شکار معاشرے مزید قعرِ ذلت و گمنامی کی طرف دھکیلے جاتے ہیں اس کے برعکس زندگی سے آنکھیں چار کر سکنے والا فن ہی خودی سے نا آشنا قوموں کو خودی کے زیور سے آشنا کر کے قوم کو زندگی کے عملی میدانِ جنگ میں قدم رکھنے کے قابل بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے خیال میں ایسے ہی شاعروں یا فن کاروں کے دلوں میں قومیں جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا اقبال کے نزدیک اگر فنون حیات آور اقدار کے حامل ہیں۔ ان میں زندگی کے مسائل کی تفہیم اور ان کے حل کا مادہ موجود ہے۔ وہ زیورِ خودی سے آراستہ ہیں۔ اور انہیں خونِ جگر سے سینچا گیا ہے، تو ایسے ہی فنون پیغمبری کا جزو گردانے جاسکتے ہیں اور امت مسلمہ کے فنکاروں کو اپنے فنون کی بنیاد انہی خطوط پر استوار کر لینی چاہیے۔ فنون لطیفہ انفرادی سطح پر ہی نہیں قومی سطح پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں قوم کی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور تمدن کو اجاگر کرنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ان فنون کے ذریعے بین الاقوامی برادری میں کسی قوم کا تشخص واضح کیا جاسکتا ہے یوں بین الاقوامی رواداری کے فروغ کے لیے ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے زندہ قومیں اس کے فروغ کی کوششیں کرتی ہیں۔ فنون لطیفہ جمالیات کی دین ہے جمالیات کے مطالعے کے بغیر فنون لطیفہ کا مطالعہ ممکن نہیں۔ جمالیات وہ صفت ہے جس کے ذریعے کوئی چیز اس کے فوائد سے قطع نظر ہمیں پسند آتی ہے اور بے غرضی اور مسرت پر اکساتی ہے۔

اگر ہم پاکستان میں فنون لطیفہ، بالخصوص مصوری کی بات کریں تو جب متحدہ ہندوستان تھا تو اس وقت مغل سکول آف مصوریاور ٹیگور سکول آف آرٹ چھایا ہوا تھا۔ ٹیگور کی مصوری ہندو مذہب کے گرد گھومتی تھی پورٹریٹس، فگرز اور مجسمے بنانے میں کوئی عار نہیں تھا بلکہ مصوروں کے یہ پسندیدہ موضوعات تھے اور اگر غور کیا جائے تو مصوری نے تبلیغ کا کام کیا جس کے اثرات دیر پا ثابت ہوئے چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے۔ اسی طرح چند مسلامان مصور مغل انداز مصوری کی ہی پیروی کر رہے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں پر مصوری اسلامی اقدار کے مطابق ڈھل گئی۔ یعنی کیلیگرافی کی طرف رجحان ہو گیا اور لینڈ سکیپس اور سٹی سکیپس مصوروں کے پسندیدہ موضوعات بن گئے۔ گو کہ تجریدی آرٹ ساتھ ساتھ اپنے عروج پر رہا مگر پھر بھی عام لوگوں کی پسند ریلیزم کے قریب رہی ہاں البتہ تصاویر میں انوکھے پن کی تلاش نے مختلف تجربات کو جنم دیا۔ گہرے رنگوں کا استعمال اور چند ایک سٹروکس کے ساتھ فن پاروں کی تکمیل ہونے لگی حالانکہ پینٹنگ میں مصور کے جذبات اور احساسات کا اظہار خوبصورت انداز میں ہونا چاہیے۔ تاریخ کے مطابق ہر دور میں مصور کسی نہ کسی مقصد کے لئے فن پارے تیار کرتے رہے۔ ان نظریات کے رد عمل کے طور پر آرٹ کے مختلف سکول حقیقت پسند، تاثر پسند، اظہار پسند، مکعب پسند، دادا مکتب فکر 'علامت پسند اور تجریدیٹ وغیرہ وجود میں آئے۔ مگر پاکستان کی مصوری ابھی تک اپنے ماحول کے مطابق ان ایجاد شدہ سکولوں کے ارد گرد گھوم رہی ہے شاید اس لئے کہ ذہنی معیار اور ذوق جمالیات کی ضرورت یہاں تک سمجھی جاتی ہے۔ پاکستانی مصوری کے ابتدائی بڑے ناموں میں صادقین، عبدالرحمٰن چغتائی، شاکر علی، احمد پرویز، اُستاد اللہ بخش، جمیل نقش، زین العابدین، اقبال مہدی، آذر زوبی، ظہورالاخلاق، گل جی قابل کر ہیں کہ انہی کے دم قدم سے عالمی سطح پر پاکستانی مصوری کو شہرت ملی ہے۔ اگر کہا جائے کہ مذکورہ مصوروں یا بعد کے مصوروں میں فکر اقبال کے مطابق اسلامی تہذیب کو مصور کرنے کی کوئی تحریک چلی ہو تو ایسا نہیں۔ ہاں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی کیلی گرافی میں مسلمان مصوروں اور پاکستانی مصوروں نے اپنی پہچان ضرور بنائی ہے۔ جس جلال و جمال کے اقبال خواہاں تھے وہ ہمیں کیلی گرافی میں نظر آتا ہے۔

اگر پاکستان میں فن موسیقی کی بات کی جائے تو پاکستان کے کلاسیکل گلوکاروں اور غزل گائیگ کا جوڑ پوری دنیا میں نہیں ہے، اُستاد سلامت علی خان، اُستاد نزاکت علی خان، اُستاد امانت علی خان، اُستاد نصرت فتح علی خان، استاد راحت علی خان، ملکہ موسیقی روشن ،اُستاد شریف پونچھ والے ستار نواز، اُستاد شوکت حسین طبلہ نواز اور پلے بیک گلوکاروں میں شہنشاہِ غزل مہدی حسن، سلیم رضا، منیر حسین، احمد رشدی، مسعود رانا اور کئی نامور گلوکاروں کا جوڑ دنیا میں نہیں ہے، ان اُستادوں نے سُر اور تال کا وہ حسین ملاپ پیدا کیا کہ جس نے برصغیر میں موسیقی کو امّر کر دیا۔ خواتین میں ملکہ ترنم نور جہاں، غزل میں فریدہ خانم، اقبال بانو اور عابدہ پروین کا ثانی کہاں مِلتا ہے؟ موسیقی کے ان درخشاں ستاروں نے فنِ موسیقی پر عبور حاصل کیا اور فن کو لافانی بنا دیا۔[46] اب نئے آنے والے گلوکاروں اور موسیقاروں کو فن پر عبور تو کیا ابتدائی تعلیم کا بھی علم نہیں ہے، دوسرے شعبوں کی طرح موسیقی کا شعبہ بھی تنزلی کا شکار ہے، آج کے دَور میں ریاضت نظر نہیں آتی، نئے گلوکاروں کی گائیکی میں رکھاپن ہے، اُن سے سُر ہی نہیں لگتا، زیادہ تر بے سُرے ہیں۔ موسیقی کوئی بھی ہو چاہے پوپ میوزک ہی ہو، موسیقی کے بنیادی اُصولوں پر چلنا انتہائی ضروری ہے وگرنہ وہ موسیقی نہیں ڈھول پیٹنا ہے۔ موسیقی الگ ہے ڈھول پیٹنا الگ چیز ہے۔ موسیقی کے زوال کی بہت بڑی وجہ موجودہ میڈیا بھی ہے وہ اس بات کا خیال رکھے بغیر جنہیں وہ میوزک کے حوالے سے اپنے مختلف چینلز میں پیش کر رہے ہیں انھیں اس فن پر عبور بھی حاصل ہے کہ نہیں یا وہ اس فن کو سمجھتے بھی ہیں کہ نہیں، میڈیا کی وجہ سے اصل فنکاروں،

موسیقاروں اور اُستادوں کی بہت حوصلہ شکنی ہو رہی ہے، اب کمرشل ازم کا دور ہے، جو چیز چمکتی ہے لوگ اُسی کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں، اُستاد نصرت فتح علی خان نے لوگوں کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے موسیقی کو نئی جہت دی مگر سُر اور تال کو پکڑ کر کام کیا، یہ ہوتا ہے فن کی جدت میں بھی آپ اصولوں کے راستوں کو نہ چھوڑیں۔ اگر اقبال کی بات کی جائے تو اقبال فن برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اگرچہ جنگوں کے دوران کئی نغمے لکھے گئے جن سے عوام اور پاک فوج میں جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور اس کے علاوہ بھی پاکستان میں عمدہ ملی نغمے بھی گائے گئے ہیں جو حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس وقت ملکہ ترنم جہاں، عالم لوہار، نذیر بیگم، مسعود رانا، شوکت علی اور عنایت حسین بھٹی کے نغموں نے بہت شہرت حاصل کی۔ مگر یہ نغمے تعداد میں کم ہیں۔ ہاں قوالی ابتدا سے پاکستان میں مقبول رہی ہے، مگر بہت حد تک اب قوالی بھی روبہ زوال ہے۔ اس وقت کے قوالوں میں عزیز میاں اپنی مثال آپ ہیں۔ بلاشبہ فنون لطیفہ میں اقبال جس اسلامی مخصوص انداز اور پہچان کے خواہاں تھے وہ فنون لطیفہ کے کسی بھی شعبے میں نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ جس فن تعمیر پر اقبال کو ناز تھا اب وہ شعبہ بھی یورپ سے متاثر نظر آتا ہے۔ بزرگوں کے مقبروں اور چند سرکاری عمورتوں کے علاوہ عوامی گھروں اور بلند و بالا عمارتوں میں یورپ کی نقالی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جب کہ اقبال فنون لطیفہ میں عظمت و بلندی پیدا کرنے کا درس دیتے ہیں جو صرف اور صرف خونِ جگر ہی سے ممکن ہے۔ اگر اُس میں سعیِ پیہم، جدوجہد، محنت اور عشق و جنون کا عنصر شامل نہ ہو تو فن میں کمال نہیں آسکتا۔ یہی اقبال کا نظریۂ فن ہے جو وہ تمام فنون لطیفہ کیلئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا ادب، مصوّری، شاعری، موسیقی و سنگ تراشی وغیرہ اسی وجہ سے اپنا معیار ان معنوں میں کھو چکے ہیں کہ اس کے ذریعے ایسی نسل تیار نہیں ہو رہی جو اسلام کا منشا ہے۔ یہ قوم کو زہر اور نشے کا ٹیکہ لگا کر سُلا رہی ہے۔ پاکستان کے مسلمان اگر عروج حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں زوال سے نکالنا ہو گا اور زوال سے نکلنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو قوم کی رگوں کو حیات سے نوازے۔ اسطرح مصوّری، موسیقی، سنگ تراشی و دیگر فنون کو اعلیٰ مقاصد کی خاطر استعمال کرتے ہوئے مسلم تشخص ابھارا جائے۔ اور اس کے ذریعے مسلمانوں میں وہ خوبیاں دوبارہ بیدار کی جائیں جن کی بنیاد پر انھوں نے پوری دُنیا کو اپنا گرویدہ اور زیر اثر بنایا تھا، اور صرف زمین ہی مسلمانوں کے قبضے میں نہیں تھی، بلکہ علم، سیاست، معاشرت، تہذیب و ثقافت، سائنس و ٹیکنالوجی غرض تمام شعبوں میں مسلمان انسانانِ عالم و اقوامِ عالم کیلئے راہنمائی کا نمونہ تھے۔

حوالاجات

[1] محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران، فروری، ۲۰۰۶ء) ص: ۶۶۴
[2] افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، فروغ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص: ۱۷۱
[3] گوپی چند نارنگ، اقبال کا فن (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء) ص: ۲۳۲
[4] شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر، اقبال اور فُنون لطیفہ (دہلی: لاہوتی پرنٹنگ پریس، بار اوّل، سن ندارد) ص: ۸۸
[5] محمد اقبالؒ، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران، فروری، ۲۰۰۶ء) ص: ۴۶۶، ۴۶۵
[6] اسلم انصاری، ڈاکٹر، اقبالِ عہد آفریں (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۱ء) ص: ۱۴۹، ۱۴۸
[7] عتیق انور راجہ، فنون لطیفہ سے بہترین معاشرہ، نوائے وقت لاہور، ۱۴۔ اکتوبر ۲۰۱۹ء۔
[8] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو) (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، طبع دوم، ۲۰۱۰ء) ص: ۴۹۳

[9] ایضاً، ص:۴۹۳
[10] اسلم انصاری، ڈاکٹر، اقبالِ عہد آفریں (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم، ۲۰۱۱ء) ص:۱۴۹
[11] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو) (لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، طبع دوم، ۲۰۱۰ء) ص:۴۹۳
[12] اسلم انصاری، ڈاکٹر، اقبالِ عہد آفریں (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم، ۲۰۱۱ء) ص:۱۴۹
[13] فرمان فتح پوری، ڈاکٹر اقبال سب کے لیے (لاہور: ابو قار پبلی کیشنز، طبع اوّل، ۲۰۰۹ء) ص:۲۳۴
[14] عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل (حیدر آباد: اقبال اکیڈیمی، ۲۰۰۸ء) ص:۳۸۷
[15] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو۔ ص:۵۸۰
[16] جاوید اقبال اپنا گریباں چاک (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ص:۲۳
[17] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء) ص:۵۹۳
[18] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو)۔ ص:۴۹۶
[19] اقبال احمد خان، تسہیل زبور عجم (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء) ص:۶۱۶
[20] محمود نظامی، ملفوظات اقبال (لاہور: اشاعت منزل، ۱۹۴۹ء) ص:۱۸۴
[21] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو۔ ص:۵۹۵
[22] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو) ص:۴۹۶
[23] محمد عبد اللہ قریشی، روح اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷) ص:۱۷
[24] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو۔ ص:۵۷۶
[25] جاوید اقبال، زندہ رود (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء) ص:۹۹۲
[26] ابو اللیث صدیقی، ملفوظات اقبال، (لاہور: اقبال کادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء) ص:۲۲۴
[27] محمد فرمان، اقبال اور آرٹ، مشمولہ مطالعۂ اقبال (مجموعہ مقالات) مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، بزمِ اقبال، لاہور، طبعِ دوم ۱۹۸۳ء) ص:۲۶۷
[28] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو)۔ ص:۵۰۲
[29] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع دوم، ۱۹۷۵ء) ص:۵۹۰
[30] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو) ص:۵۰۳
[31] شیما مجید، مرتبہ، مقالات چغتائی (اسلام آباد: ادارہ ثقافت پاکستان، ۱۹۸۷ء) ص:۲۷
[32] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو)۔ ص:۵۰۸۔۵۰۹
[33] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو۔ ص:۶۷۹
[34] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو)۔ ص:۵۰۹
[35] ایضاً، ص:۵۰۹
[36] ایضاً، ص:۵۱۰
[37] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو۔ ص:۳۸۵

[38] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو)۔ ص:۵۱۵
[39] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو۔ ص:۳۸۵
[40] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو)۔ ص:۵۱۵
[41] ایضاً، ص:۵۱۵
[42] ایضاً، ص:۵۱۵
[43] عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل (حیدر آباد: اقبال اکیڈیمی، ۲۰۰۸ء) ص:۳۳۳
[44] یُوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح زبور عجم (اُردو)۔ ص۵۱۶
[45] محمد اقبال، کلیات اقبال اُردو۔ ص:۴۰۳
[46] ظفر سجاد، فن موسیقی زوال کا شکار کیوں؟ (ایکسپریس لاہور، ۲۶ جنوری ۲۰۲۰ء)